محترمہ سروری رانا

شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار و نظریات

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی اسلام کی کشتی منجدھار میں پھنسی تو پردۂ غیب سے اس کی مدد کے لیے کوئی نہ کوئی مردِ باصفا آیا اور اس کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچا دیا۔ اسلامی ہند کی تاریخ میں مسلمانوں پر دو موقعے ایسے آئے تھے، جب ہر شخص کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان خطرات سے جانبر ہونا مشکل ہے۔ لیکن دونوں مرتبہ ملت کے دو نامور رہنماؤں کی دینی خدمات نے ان خطرات کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا اور تخریبی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ پہلی مرتبہ جب کہ اکبر بادشاہ دینِ الٰہی کی ترویج کے لیے کوشش کر رہا تھا، حضرت مجدد الف ثانی میدان عمل میں آئے اور اکبری فتنے کا سدِّباب کر دیا اور دوسری مرتبہ جب سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر ہو جانے اور مخالف عناصر کے ابھرنے سے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی تباہی کے خطرات کا سامنا کرنا پڑا اور سارے ملک میں افراتفری پیدا ہو گئی تو ایک اور عظیم مصلح شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی ہدایت و رہبری کا فرض بہت کامیابی سے انجام دیا۔

شاہ ولی اللہ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیرؒ نے وفات پائی اور اس کے بعد عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر ہونے لگی۔ نادر شاہ کے حملے نے بڑی کاری ضرب لگائی اور رہی سہی قوت بھی ختم ہونے لگی۔ مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے سب ابھرنے لگے۔ ملک کے گوشے گوشے میں باغیانہ قوتیں کام کرنے لگیں اور شاہانِ مغلیہ کا تخت و تاج تک خطرے میں پڑ گیا۔ مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی اور معاشرتی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور جن علاقوں پہ مرہٹوں اور سکھوں کا غلبہ تھا وہاں ان کے لیے اسلامی احکام پر عمل کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کا زمانہ یہی نازک دور تھا۔ اس کے بارے میں خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی

مکتوبات" میں رقم طراز ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ نے جب آنکھ کھولی تو سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب لبِ بام آچکا تھا معاشرہ اور سیاست کا پرانا نظام منہدم ہو چکا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں زوال و انحطاط کے اثرات نہایت سرعت کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ سارا نظام کھوکھلا ہو چکا تھا اور اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ مرکز کے کمزور ہو جانے کے بعد ساری سلطنت میں ابتری بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔"

طباطبائی اپنی کتاب سیر المتاخرین میں لکھتا ہے:

"گورو گوبند نے اپنے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے پراگندہ اور منتشر افراد کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ جب گوبند کا جانشین بندا نامی گورو ہوا تو یہ اہلِ اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پاتا، چڑھ دوڑتا اور باشندوں میں جس کسی کو مسلمان دیکھتا زندہ نہ چھوڑتا، خواہ کمسن ہو یا بچے ہی کیوں نہ ہوں۔"

طباطبائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے باہر نکال کر مار ڈالتے تھے۔ سکھوں کی مسلم دشمنی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ سکھ مسلمانوں کو بلند آواز سے اذان نہیں دینے دیتے تھے۔ مسجدوں کو اپنی تحویل میں لے کر گرنتھ پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ" میں رقم طراز ہیں:

اس زمانے میں شمالی ہندوستان کی سیاست میں واحد عنصر جس سے کچھ امید کی جا سکتی تھی، روہیلوں کا تھا۔ وہ کٹر مسلمان تھے اور طبقاتی امتیازات نے ان کے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا نہیں کیا تھا۔ وہ انحطاط پذیر، درماندہ اور از کار رفتہ نہ تھے۔ ان کی خوبیاں انھیں مسلمانوں کی آئندہ قیادت کے لیے دوسروں سے ممتاز بناتی تھیں۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ شاہ صاحب نے دہلی میں مسلم اقتدار کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے انھیں استعمال کیا۔

چنانچہ شاہ صاحب نے مفسد عناصر کی سرکوبی کے لیے دو طاقتور شخصیتوں کو منتخب کیا۔ ایک تو نجیب الدولہ یعنی روہیلے، اور دوسرے احمد شاہ ابدالی فرمان روائے افغانستان۔

شاہ صاحب پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ سلطنت مغلیہ کو تقویت پہنچانے کا خیال کسی بیرونی امداد کے بغیر بے کار ہے اور واحد مسلم طاقت جو کچھ مدد دے سکتی تھی وہ افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قائم کردہ نئی سلطنت تھی۔

دراصل شاہ صاحب نے ان دونوں کے انتخاب میں زبردست سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔

روہیلوں کی عسکری طاقت اور صلاحیت بے پناہ تھی۔ شاہ صاحب کی بالغ النظری، سیاسی بصیرت اور حقائق شناسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دو ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا کہ جن کو بیسویں صدی کا مؤرخ ہند اٹھارویں صدی کی سب سے زیادہ قابل شخصیتیں تصور کرتا ہے۔

شاہ صاحب نے سیاست کا بڑا اچھا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم مفکر تھے۔ انھوں نے سلطنت مغلیہ کے حالات کا بڑی اچھی طرح تجزیہ کیا۔ ان کی تصانیف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں مسلم معاشرہ کے زوال کے اسباب مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا اہم سبب انھوں نے اقتصادی انحطاط کو قرار دیا جس کی وجہ سے تمام سیاسی انتشار اور بدنظمیاں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو، اس میں طرح طرح کے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں، نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے مسلم سوسائٹی کے ہر طبقے سے خطاب کر کے اس کی بے راہ روی سے آگاہ کیا۔ تفہیمات الٰہیہ میں انھوں نے مسلم معاشرے کے ایک ایک گروہ کو نام بنام مخاطب کیا اور ان کے نقائص بیان کیے۔ جہاں تک معاشی خرابیوں کا تعلق ہے اس میں تقریباً ہر طبقے کو یکساں گرفتار پایا۔ چنانچہ وہ امیروں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

"اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ۔ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو، اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔"

سپاہیوں سے کہتے ہیں :

"تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ جس سے تمہاری زندگی اور جسم کا رشتہ قائم رہ سکے۔

عوام کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں :

"اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔"

اسباب زوال

اسلامی ہند کے نقائص سے قطع نظر شاہ صاحب نے سلطنت کے زوال کے اسباب حجۃ اللہ البالغہ میں اور اپنے مکتوبات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں :

"اس زمانے میں ملک کی خرابی و ویرانی کے عام طور پر دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک تو بیت المال یعنی ملک کے خزانے پر تنگی، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعویٰ سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جن کا حق اس خزانہ کی آمدنی میں ہے یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو خود بادشاہ انعام و اکرام دیا کرتے ہیں۔ جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک و سلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی طریقے سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔ یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں، ملک پر بوجھ ہیں۔ دوسرا

سبب کاشتکاروں اور بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے، یہاں تک کہ جو بے چارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں، جو سرکش ہیں وہ اور سرکش ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت کے محصول ادا نہیں کرتے۔ حالانکہ ملک و سلطنت کی آبادی محصول اور فوج اور عہدہ داروں کے بقدر ضرورت تقرر پر ہے، چاہیے کہ اس زمانہ کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

مکتوبات میں ان ہی بنیادی خرابیوں کی تشریح کی ہے اور زوال کے یہ اسباب متعین کیے ہیں:

۱۔ خالصہ کے علاقے کا محدود ہونا۔ ۲: خزانے کی قلت۔ ۳: جاگیرداروں کی کثرت۔ ۴۔ اجارہ داری کے مسموم اثرات۔ ۵: افواج کے واجبات کا بروقت نہ ملنا وغیرہ وغیرہ۔

آج کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مورخین سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے اسباب کا اس قدر صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے جتنا کہ شاہ صاحب نے اس طوفانی دور کے ہوتے ہوئے بھی کیا۔ اس سے ان کی بے پناہ سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اجتماعی معاشرہ

شاہ صاحب نے انسانی اور حیوانی زندگی کا بڑی اچھی طرح تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے حیوانات کی دو اقسام بتائی ہیں۔ ایک ایسے جانور جو زمین میں پیدا ہوتے ہیں، انھیں فطرت غذا حاصل کرنے کا طریقہ سکھاتی ہے اور یہ جانور اجتماع پسند نہیں ہوتے۔ لیکن جانوروں کی ایک اور قسم ہے جو اجتماعی زندگی کے قائل ہوتے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھیاں اور پرندے وغیرہ وغیرہ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: انسان بھی حفاظتِ نفس اور بقائے نسل کی خاطر اجتماع کا محتاج ہے بلکہ دیگر حیوانات کے مقابلے میں انسان دوسروں کا زیادہ دستِ نگر ہے۔

جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے: "آدمی ایک سوشل (معاشری) حیوان ہے۔" انسانوں کی اجتماعی زندگی ان جانوروں سے بہتر ہونی چاہیے، ان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قوانین ہمیں قرآن مجید سے مل سکتے ہیں۔ قرآن کے قوانین ہماری عام زندگی پر حاوی ہیں۔ پھر اسلام اجتماعی زندگی کا قائل ہے۔ مثلاً جمعہ و عیدین کی نماز اور حج

وغیرہ اجتماعی حیثیت سے ادا کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ اجتماعی زندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

معاشرہ کی ارتقائی منازل

شاہ صاحب نہ صرف معاشرہ کے ارتقا پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ اس کی چار تدریجی منازل بھی متعین فرماتے ہیں۔ ان میں سے ہر منزل اسی ترتیب کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ممکن نہیں کہ بعد کی منزل پہلے اور پہلی منزل بعد میں آئے۔ البتہ پہلے درجے کی تکمیل سے قبل ہی معاشرہ دوسرے درجے میں قدم رکھ سکتا ہے وہ درجے یہ ہیں:

پہلی منزل میں انسانی معاشرہ حیوانی اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ انسان کے باہمی تعلقات نہایت سادہ اور ابتدائی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس مرحلے میں انسان کو وہ ضروریات درپیش ہوتی ہیں جن سے ان کا چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی اپنے جغرافیائی حالات کے باعث جو کچھ ہی کیوں نہ ہوں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

دوسری منزل۔ جب انسان اپنے تمام فطری تقاضوں کی تکمیل کر لیتے ہیں تو اجتماع ایک اور کروٹ لیتا ہے اور انسان کی مخصوص نفسیات، نصب العین کا تعین، نفاست پسندی اور تجسس اس کو دوسری منزل میں داخل کر دیتی ہیں۔ علوم کے حصول کا شوق بھی انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اب بڑھی ہوئی ضروریات اس فطری شوق سے مل کر مختلف علوم و فنون پیدا کر دیتی ہیں۔

تیسری منزل میں بھی معاشرہ نئے نئے تجربات کے ذریعے سے نئے نئے علوم تک رہنمائی حاصل کرتا ہے اور پرانے علوم جو دوسرے دور میں ایجاد ہوتے ہیں، ان کی مزید اصلاح کرتا ہے۔ اس دور میں تمدن وجود میں آتا ہے اور ایک منظم سیاسی نظام بھی وجود میں آ چکا ہوتا ہے۔

چوتھی اور آخری منزل میں پہنچ کر معاشرہ بین الاقوامی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی بڑھتی ہوئی خواہشات کے پیشِ نظر چھوٹے چھوٹے شہر متحد ہو جاتے ہیں۔ اس بین الاقوامی معاشرہ کو وہ خلافت کا نام دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ معاشرہ اور خلافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ان کے خیال میں تیسری منزل میں پہنچ کر باقاعدہ مملکت وجود میں آجاتی ہے۔ جسے وہ لفظ مدنیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مدنیہ سے مراد دراصل اجتماع ہے نہ کہ شہر پناہ اور قلعہ۔

شاہ صاحب ریاست میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے سلطان کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں، ان کے نزدیک سلطان میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہئیں:

سلطان کے اوصاف

سلطان کے لیے بلند اخلاق، رحم دل، شجاع و بہادر اور عقل مند ہونا نیز اس کا عالی نسب ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ امام ماوردی کی طرح شاہ صاحب بھی سلطنت کو جنس قوی کے ہاتھ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور عورت کی حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ سلطان کے لیے فصیح الکلام ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے صحیح الاعضا ہونا بھی لازمی ہے۔

سلطان کے فرائض

شاہ صاحب کے نزدیک سلطان کا بنیادی فرض شر پسند افراد کی سرکوبی کرنا ہے تاکہ مملکت میں امن و امان بحال رہے۔ اقتصادی خوش حالی، علوم و فنون کی ترویج، رعایا سے جائز ٹیکس وصول کرنا، عیش و عشرت اور فضول خرچیوں سے پرہیز کرنا سلطان کے فرائض میں شامل ہے۔ نظام الملک طوسی کی طرح شاہ صاحب ملک میں امن و امان کی بحالی کے لیے بادشاہ کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ پوری ریاست میں وہ جاسوسوں کا جال بچھا دے۔

عمّالِ حکومت

شاہ صاحب کو اس امر کا احساس ہے کہ اتنے بہت سے کام کا سرانجام دینا ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ لہٰذا وہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ سلطان اپنے فرائض کو بخوبی سرانجام دینے کے لیے چند افراد کو منتخب کرے۔ اسی طرح شاہ صاحب کابینہ کے قیام اور عہدوں کی تقسیم کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان وزرا کی شرائط و فرائض دونوں سے بحث کرتے ہیں۔

انھوں نے مندرجہ ذیل شرائط وزرا کے لیے لازمی قرار دی ہیں:

۱۔ دیانت دار ہوں۔

۲ - کاروبارِ مملکت کے چلانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔
۳ - وزرا میں خیر خواہی اور وفاداری کی صفات ہونی چاہئیں۔
۴ - ایسے شخص کو عہدہ نہ دیا جائے جسے برطرف کرنا مشکل ہو۔

تنخواہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اراکین حکومت جب تک ملکی خدمات میں مصروف رہیں حکومت کو اُن کی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ حضرت ابوبکرؓ کے طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد انھوں نے بیت المال سے وظیفہ لیا۔ وہ تنخواہ کے علاوہ حسنِ کارکردگی پر انعام دینے کے حق میں بھی ہیں۔

اہم عہدے دار

شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں پانچ ایسے عہدے گنوائے ہیں جن کے بغیر حکومت کا کام چلانا ناممکن ہے۔ وہ یہ ہیں:

قاضی: فصلِ خصومات کے لیے قاضی کا ہونا ضروری ہے۔

وہ قاضی کو مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں:

۱ - مرد ہو، عورت نہ ہو۔ (۲) آزاد ہو، غلام نہ ہو۔ (۳) عاقل و بالغ ہو۔ (۴) حلیم و بردبار، (۵) محتاط اور (۶) عادل ہو۔

وکیلِ مطلق: اس کا کام صرف یہ ہے کہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کی ذاتی ضروریات کی طرف توجہ دے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ فرض شناس بادشاہ کو ملکی مہمات سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ذاتی ضروریات کی طرف توجہ دے، اس لیے اس کے مفاد کی نگرانی کے لیے ایک عہدہ دار کے تقرر کی وہ سفارش کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام: اس کا فرض ہے کہ امورِ شرعیہ کی نگرانی کرے۔ اسلامی احکام کی ترویج کرے۔ لوگوں میں مذہبی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اسے بیدار رکھے۔

ناظم التعلیم: دینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم کی ترویج کی ذمہ داری شاہ صاحب اس کو سونپتے ہیں۔ ان علوم میں وہ طب، نجوم، تاریخ، حساب، انشا کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

سپہ سالار: یہ بھی بہت اہم عہدہ ہے۔ اس کے فرائض غیر شرعی عناصر کی سرکوبی اور قیام امن ہے۔ اس کے وہ مختلف اوصاف بیان کرتے ہیں:

۱۔ حکومت کے پاس جتنا بھی اسلحہ اور سامانِ حرب ہو اس کو استعمال کرنے کا طریقہ جانتا ہو۔

۲۔ فوجیوں اور بہادروں کی حوصلہ افزائی کے طریقوں سے واقف ہو۔

۳۔ فوج کے تمام افراد کو فرداً فرداً جانتا ہو۔

۴۔ لشکروں کی ترتیب و تنظیم میں ماہر ہو۔

۵۔ محکمۂ جاسوسی کی تنظیم کر سکتا ہو۔

۶۔ دشمنوں کی خفیہ تدابیر کا اندازہ لگا سکتا ہو۔

۷۔ لشکر میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

سائس المدینہ: مملکت کے نظم و ضبط کا قیام اس کے فرائض میں داخل ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس عہدے پر فائز ہونے کی مندرجہ ذیل شرطیں ہیں:

۱۔ انتظامی امور کا تجربہ اور صلاحیت رکھتا ہو۔

۲۔ اس چیز سے اچھی طرح آگاہ ہو کہ کون کون سے امور فتنہ و فساد کے موجب بنتے ہیں اور کن طریقوں سے معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

۳۔ قانون اور اصول کا سخت پابند ہو۔

۴۔ حلیم الطبع، بردبار اور سنجیدہ ہو۔

عامل: یہ محکمۂ مال کا سربراہ ہو، جو محصول عائد کرے۔ اس عہدہ دار کے لیے مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ مالی امور کا وسیع تجربہ رکھتا ہو۔

۲۔ اثر و رسوخ کا مالک ہونا چاہیے۔

۳۔ تدبیر اور حسنِ سلوک کی خوبیوں کا بھی اس میں ہونا ضروری ہے۔

۴۔ عادل ہو۔

آج دو صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی شاہ صاحب کے یہ افکار ہمارے سیاسی معاملات میں

رہنمائی کر سکتے ہیں اور وکیل مطلق کے سوا اس دورِ جدید میں بھی ان کے بتلائے ہوئے کسی عہدے کی اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

مجلسِ شوریٰ

شاہ صاحب شوریٰ کی اہمیت سے بھی واقف ہیں۔ وہ بادشاہ کو مشورے کی تاکید کرتے ہیں۔ بالخصوص کسی ملک پر فوج کشی کرنے سے پہلے یا کسی سرکش کو سزا دینے سے قبل وہ بادشاہ کیلئے ارکانِ شوریٰ سے اس معاملے میں تبادلۂ خیال کو نا بے حد ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس طرح وہ بڑی حد تک سلاطین کی مطلق العنانی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس امر کی وضاحت نہیں کرتے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کون لوگ ہوں، لیکن وہ عورتوں اور شاہی خاندان کے افراد سے مشورہ لینے کے سخت خلاف ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو مغلیہ خاندان کی تباہی کا باعث بنے تھے۔ شاہ صاحب سلطان کو اراکینِ شوریٰ کے مشورے کے خلاف فیصلہ کرنے کا بھی حق دیتے ہیں جسے ہم دورِ جدید کی اصطلاح میں "ویٹو پاور" کہہ سکتے ہیں۔ اس طریقے پر حضرت ابوبکر صدیق رض کے طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہیں۔

معاشیات

شاہ صاحب کے سیاسی افکار میں معاشیات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان سے پہلے کسی اور مفکر نے اس طرف کما حقہ توجہ نہیں دی۔ شاہ صاحب کا انتقال کارل مارکس کی ولادت سے ۵۶ سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود شاہ صاحب معاشی عدم تعاون سے جس منطقیانہ انداز سے بحث کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ مارکس سے کہیں بڑھ گئے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی شاہ صاحب کے معاشی نظریات کے متعلق اس طرح تحریر کرتے ہیں:

گو حیوانی زندگی کے لیے اقتصادی ضروریات تسلیم کی جاتی ہیں لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی۔ ہمارے بڑے بڑے عقل مند اور زیادہ با اخلاق صوفیا سب کے سب اجتماعی سیاست سے اپنا اپنا فیض پہنچاتے رہے۔ یہی تصوف کی کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی تھی کہ ...

کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتہ اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اس صحیح شکل میں پہنچایا اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی توجہ دلائی۔

شاہ صاحب نے دولت کے فوائد و نقصانات کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا۔ ان کا خیال ہے کہ دولت اچھی اور بری دونوں طرح کی خصوصیات کی حامل ہے۔ ایک طرف اس کے ذریعے سے انسان اخلاقی نشوونما پاتے ہیں اور دولت ہی انسان کو بے کسی کی زندگی سے مصئون و مامون رکھتی ہے۔ دوسری طرف یہی دولت افراد میں بغض و حسد کا بیج بھی بوتی ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کو لوٹ مار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ آخرت سے بالکل غافل کر دیتی ہے۔ اس لیے شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ دولت کے استعمال میں بے حد احتیاط برتنی چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس معاشرہ میں زر پرستی کا غلبہ ہوگا، وہ معاشرہ تباہی کی نذر ہو جائے گا۔ وہ ساسانی اور بازنطینی عہد کے واقعات دہراتے ہیں جبکہ معاشرہ میں دولت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رعایا اور راعی دونوں فضول خرچیوں کا شکار ہو گئے اور عوام کی حالت بھی ہر شعبے میں ابتر ہو گئی۔

اخلاقیات

شاہ صاحب کے سیاسی افکار میں معاشیات کے ساتھ اخلاقیات کو بھی مساوی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جو اجتماع کردار کے لحاظ سے بلند ہوگا، وہی عمدہ حکمران پیدا کر سکتا ہے۔ اور پھر لائق اور با اخلاق فرماں روا ہی معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک حکومت کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ افراد کے کردار کی اصلاح کرے۔

خلیفہ

وہ خلیفہ کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی جماعت کے لیے ایک خلیفہ کا ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ اجتماعی زندگی کے مصالح خلیفہ کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

خلیفہ کے اوصاف: شاہ صاحب نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں خلیفہ کے مندرجہ ذیل اوصاف بیان کیے ہیں:

(۱) مسلمان ہو۔ (۲) عاقل و بالغ ہو (۳) عورت نہ ہو، مرد ہو۔ (۴) غلام نہ ہو آزاد ہو۔ (۵) سمیع و بصیر ہو۔ (۶) شجاع ہو، (۷) عادل ہو۔ (۸) صحت مند ہو۔ (۹) قریشی ہو۔

خلیفہ کے انتخاب کے طریقے: خلیفہ کے انتخاب کے چار طریقے بتاتے ہیں:

۱۔ کھلا انتخاب یعنی انتخاب مجمع عام میں ہونا چاہیے۔

۲۔ چند ارباب رائے سے مشورہ کرنے کے بعد خلیفہ اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے ایک آدمی کا نام پیش کرے۔ بعد میں اس فرد کو استصواب رائے عامہ کی خاطر مسلمانوں کے سامنے پیش کرے۔

۳۔ خلیفہ ایک کونسل مقرر کردے کہ وہ خلیفہ کو منتخب کرے اور پھر اس کونسل کے فیصلے کو استصواب رائے عامہ کی غرض سے مسلمانوں کے عام مجمع میں پیش کیا جائے۔

۴۔ خلیفہ کے انتقال کے بعد کوئی شخص ارباب حل وعقد یا سابق خلیفہ کے منتخب کیے بغیر حکومت پر قابو پالے تو اس کی خلافت شرعی ہوگی، اگر عوام کی اکثریت بھی اس کو تسلیم کرتی ہو۔

خلیفہ کی اطاعت: شاہ صاحب ابن خلدون سے اس امر میں متفق ہیں کہ خلیفہ نائب رسول ہوتا ہے۔ اور خلیفہ کی اطاعت لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ احادیث کی روشنی میں ایک ہی صورت بتلاتے ہیں، جبکہ امیر کی نافرمانی جائز ہے۔ وہ یہ ہے کہ خلیفہ اللہ کے احکام کے خلاف حکم دے۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خلیفہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص مسند خلافت پر بیٹھ جائے جس میں شرائط خلافت معدوم ہوں تو اس وقت بھی اطاعت کرنی چاہیے، کیونکہ اس کو حکومت سے برطرف کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ جنگ و جدال ہے۔

غلامی

شاہ صاحب کے سیاسی افکار میں غلامی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک پوری فصل اس موضوع پر لکھی ہے۔ اس میں غلامی کو قانون فطرت کے

عین مطابق قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمام انسان صلاحیت کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں سے بعض بالطبع ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں۔ کچھ افراد زیادہ ذہین اور جلاک نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے دونوں اقسام کے اشخاص ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ہر ایک کی راحت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے کہ ان کے درمیان آقا اور غلام کا رشتہ قائم ہو۔ لیکن یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان کا باہمی تعلق دوامی اور پائیدار نوعیت کا ہو۔ جب قوم و قبائل کی آپس میں لڑائیاں ہوتی ہیں تو مغلوب فریق کے بعض لوگ اسیرِ جنگ کی حیثیت سے غالب فریق کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ ان کو غلام بنانے میں مالک اور مملوک دونوں کا فائدہ ہے۔

شاہ صاحب غلامی میں معاشرہ کی فلاح دیکھتے ہیں اور غلام و آقا کے حقوق میں بہت حد تک مساوات کے قائل ہیں۔ حتیٰ کہ وہ غلاموں کو یہ حق دینا چاہتے ہیں کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے یا بغیر معاوضہ پر بھی اگر وہ آزاد ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی "شاہ صاحب بلاشبہ ایک عظیم مجدد اور مفکر تھے۔ دوسرے مسلم مفکرین کی طرح ان کا عقیدہ بھی اسلام کی ہمہ گیر نوعیت پر تھا۔ وہ ایک طرف عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات کے اصولوں اور دوسری طرف اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب معاشرہ میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اصلاح کے قابل نہ ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کا عین منشا ہے کہ اس قوم و معاشرہ کو تباہ کر دے اور پھر ایک نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو اصلاح کرتا ہے۔ یہاں شاہ صاحب ابن خلدون سے متاثر نظر آتے ہیں۔

شاہ صاحب کی تحریک کے چار دور

پہلا دور: اس تحریک کا پہلا دور شاہ صاحب کی اپنی زندگی تک قائم رہتا ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی زندگی میں جو خدمات انجام دیں۔ ان کی وفات کے بعد یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دور ۱۷۶۲ء میں ختم ہوتا ہے۔

دوسرا دور: یہ دور ۱۷۶۲ء سے ۱۸۲۴ء تک رہتا ہے۔ اس میں شاہ عبدالعزیز کو بہت اہمیت حاصل ہے اور انھوں نے شاہ صاحب کے سیاسی مسلک کو وسیع کرنے کی کوشش کی اور ان کی تحریک کو بڑی کامیابی ہوئی۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اگر شاہ صاحب سے دس آدمیوں نے فیض حاصل کیا تو شاہ عبدالعزیز سے ایک سو آدمیوں نے فیض حاصل کیا۔ یہی وہ دور ہے جب قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ اس زمانے میں مدرسۂ رحیمیہ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ وسط ایشیا تک کے طالب علم یہاں فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ جہاد پر بھی بہت زور دیا گیا تھا۔

تیسرا دور: یہ دور ۱۸۲۴ء سے ۱۸۳۱ء تک رہتا ہے۔ یہ دراصل عمل کا دور تھا۔ شاہ صاحب کی اپنی زندگی غور و فکر، تبلیغ، نشر و اشاعت اور عمل کی تھی۔ تحریک دراصل مختلف طریقوں سے پروان چڑھی۔ ۱۸۲۴ء سے جو خیالات و عقائد عوام میں پھیلنے شروع ہوئے اس دور میں ان کو کافی تقویت ملی۔ شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحی، سید احمد شہید بریلوی اس دور کے اہم ترین افراد تھے۔ سید احمد شہید نے اس تحریک کے لیے نمایاں کام کیا۔ خود سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس کے بعد وہ حج کو گئے۔ حجاز سے واپس آئے تو بمبئی میں قیام کیا۔ انھوں نے غیر مسلموں کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے روپیہ اکٹھا کیا۔ اور رضاکار بھی مہیا ہو گئے۔ دہلی سے نکلے پھر سندھ اور قندھار سے ہوتے ہوئے افغانستان اور پھر پشاور پہنچ گئے۔ جہاں انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ ابتدا میں ان کو کامیابی ہوئی اور پشاور کے گرد و نواح کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ لیکن بعد میں اندرونی مخالفت کی وجہ سے اس علاقے میں جتنے مجاہدین تھے ان کو رات کے وقت قتل کر دیا گیا اور سید صاحب اپنے چند رفقا کے ساتھ پشاور سے روانہ ہو کر ہزارہ کی طرف چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنا مرکز بنا لیا۔ اس بار پھر مخالفت نے زور باندھا اور آپ بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں میں محصور ہو گئے۔ چنانچہ بالاکوٹ کی جنگ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) میں شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ شہید ہو گئے اور ان کے بقایا مجاہدین سوات کی طرف چلے گئے اور وہاں انھوں نے اپنا مرکز قائم کر لیا۔

چوتھا دور: اس تحریک کا چوتھا دور بقول عبیداللہ سندھی مولانا محمد قاسمؒ کے

دور سے شروع ہوتا ہے۔ حاجی امداد اللہ اور مولانا رشید احمد ان کے رفقائے کار تھے۔ انھوں نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا جو بڑھتے بڑھتے عظیم دارالعلوم بن گیا۔ دراصل یہ دیوبند مدرسہ نہیں بلکہ پورا دیوبند تحریک کا نام ہے۔ اس نے شاہ ولی اللہ کے افکار کی نہ صرف ترویج کی بلکہ اسلام کی بہت زیادہ خدمت کی۔ اس مدرسہ نے ہزاروں کی تعداد میں عالم دین پیدا کیے۔ انھوں نے انگریزوں کی تہذیب و تمدن کی مخالفت کی۔ یہ لوگ پچھلے ایک سو سال سے لادینی کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں، اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات و افکار کی ترویج کے لیے آج بھی کوشاں ہیں۔

اپنی کتاب A SOCIAL HISTORY OF ISLAMIC INDIA میں ڈاکٹر محمد یٰسین اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"THE MISSION OF MUJADID ALFI-SANI THE RELIGIO-POLITICAL REFORM MOVEMENT OF THE OFFICIAL ISLAM TO ESTABLISH AN IDEAL MUSLIM STATE ACCORDING TO THE ORTHODOX NOTIONS WAS TAKEN UP AND CONTINUED BY SHAH-WALI-ULLAH ANOTHER MUJADID OF ISLAM IN INDIA.

ماخذ:

۱۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبید اللہ سندھی۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ از خلیق احمد نظامی۔

۳۔ برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔

۴۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ از شاہ ولی اللہ۔

۵۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ از شاہ ولی اللہ۔

۶۔ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی

۷۔ سیر المتاخرین۔ از طبطبائی۔

A SOCIAL HISTORY OF ISLAMIC INDIA By DY. YASIN. - ۸

FALL OF THE MUGUAL EMPIRE By SIR J.N. SARKAR. - ۹